کرنل مسعود اختر کے اُردو تراجم میں پاک ترک مشترکہ ثقافتی ورثے کا تحقیقی مطالعہ

فرحت جبیں ورک

ABSTRACT:

The ideal relationship between Pakistan and Turkey is not dependent some vested interests or joint agreements. Rather it is common cultural heritage of the two brotherly countries. The translations from Turkish literature into Urdu and vice versa make everyday communication easier. Urdu, as a medium has played its role. Sajjad Haider Yaldarm was the first writer who for his stories, their characters and culture borrowed from Turkish literature but without mentioning the origin. In this context, Col (R) Masud Akhtar, appears as a lighthouse, who spent 45 years of his life in identifying the common cultural heritage between Turkey and Pakistan through his conversions of Turkish into Urdu literature.

تہذیب و ثقافت اور ادب کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔اعلیٰ ادب اپنی جنم بھومی (جائے پیدائش) کی تہذیب و ثقافت کا عکاس رہا ہے۔ادب کا ہر رنگ چاہے وہ تخلیق ہو یا تحقیق وتنقید اپنے ادبیاتی احاطے کے آدرشوں، امنگوں، سیاسی و سماجی، نفسیاتی و معاشی رویوں ، عقائد و افکار نیز انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی خوابوں کا اظہار ہوتا ہے۔کوئی بھی تخلیق خواہ وہ شاعری ہو یا نثر کی مختلف صورتیں جن میں افسانہ، ڈرامہ، ناول، داستان، طنز ومزاح پر مبنی مضامین، خاکے وخطوط قدرے اہم ادبی رنگ ہیں ۔ یہ اصناف ادب اپنی اپنی موضوع قوم کی ثقافتی حیات کے تمام رنگ اپنے اندر سمو کر اُن کے انفرادی و اجتماعی تشخص کا اظہار کرتے ہیں ۔ثقافت کسی بھی ملک وقوم کا صدیوں کی تاریخ پر محیط طریقہ، رویہ یا خردمندی کہا جاسکتا ہے ۔کسی بھی ملک وقوم کی سماجی، معاشی، مذہبی عقائد و نظام تعلیم،

رسوم و رواج اُس ملک کی ثقافت کے آئینہ دار کہے جاسکتے ہیں ۔ڈاکٹر جمیل جالبی ثقافت کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ : ''لفظ ''ثقافت'' کا زور ذہنی صفات پر ہے جن میں علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات میں شامل ہیں''۔(۱) ثقافت یا کلچر ایک حساس مگر بے حد مضبوط رویوں کی صورت پنپتا اور پھر صدیوں کی روایت ساتھ لئے پروان چڑھتا رہتا ہے ۔اِس میں اُس خطے کی نسل دَر نسل اس ثقافت کے لیے حساسیت اس ثقافتی کیمیائی عمل کو کُندن میں ڈھال کر استحکام و دوام مہیا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''کلچر کے کثیف عناصر معاشرے کی خارجی سطح یعنی اس کے چھلکے پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان میں طرزِ بودوباش ، رسوم ،خوشی اور غم کی تقاریب، زبان، کامرانی یا ردِ بلا کے لیے اقدامات، ارد گرد کے ماحول سے اخذ و اکتساب کا رجحان اور اسی قسم کی لا تعداد دوسری صفات شامل ہیں''۔(۲)

اسی ثقافت یا کلچر کو ڈاکٹر جمیل جالبی اختصار کے پیرائے میں یوں بیان کیے دئے ہیں کہ :

''کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کا خواہ وہ ذہنی ہوں یا مادی ، خارجی ہوں یا داخلی، احاطہ کر لیتا ہے۔(۳) یہی وہ ثقافت کے مختلف رنگ رُوپ ہیں کہ جن کا اظہار ادب کے پیرائے ہیں کیا جاتا ہے ۔یعنی لامحالہ طور پر فنونِ لطیفہ ایک جسم اور ثقافت اس میں روح کا کام کرتی ہے ۔یقیناً جو ادب ثقافتی رویوں سے عاری ہو گا وہ مردہ جسم کے ساتھ کتنا سا عرصہ اپنے وجود کے بقا کی جنگ لڑ سکے گا۔ایک عمدہ فن پارہ اپنے خطے کے ثقافت و تمدن کا عکاس ہوتا ہے ۔بہت سے ممالک کے سیاسی وسماجی نیز معاشی حالات قدرے ملتے جُلتے ہونے کے باوجود اُن میں مشترکہ مفادات کے حصول کی تگ و دو یا پیار ومحبت دلچسپی ولگن کے جذبات ناپید ہی رہتے ہیں مگر کچھ ممالک یقیناً دُنیا میں ایسے ضرور ہیں کہ جن میں مشترکہ مفادات کی فہرست کی عدم دستیابی کے باوجود اُن میں محبت، رواداری و بھائی چارے کی اُمنگ پائی جاتی ہے۔قوموں یا ملکوں میں امن و بھائی چارہ چندصورتوں میں خودبخود پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جذبہء حب : ''۔۔۔ایک مشترکہ تاریخ، ایک مشترکہ تہذیبی شعور، مشترکہ ورثے اور متفقہ قومی اداروں سے رونما ہوا تھا''۔(۴)

ان عناصر حُب میں سے مشترکہ ثقافتی ورثہ دوقوموں یا ملکوں کی عوام کی خوش بختی تصور کیا جاتا ہے مگر کہ جس کی بنا پر پاک تُرک دوستی کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔پاک تُرک دوستانہ کسی مفاد کا متلاشی نہیں بلکہ اس محبت کے پیچھے بھی آبا سے آبا کی محبت کا ثقافتی رویہ صدیوں کا سفر طے کر آیا ہے۔

امن اور دوستی کا رشتہ بھائی چارے کی بنیاد بنتے ہیں ۔ پاک تُرک دوستی بھائی چارے کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ دوستی اُردو زبان سے محبت ومشترک مذہبی بنیادوں پر تو استوار ہے مگر بہت سی چیزیں قدریں ایسی بھی ہیں کہ جن کو ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے مندرجہ بالا حوالوں کی روشنی میں دیکھنا بجا ہو گا۔ یہی وہ مشترکہ طرزِ بودوباش، رسوم ،خوشی اور غم کی تقاریب ، اُردو زبان کے فروغ کی چاہت، کامرانی یا ردِ بلا کے لئے اقدامات، ارد

گرد کے ماحول کی اچھائیاں، برائیاں دیگر سماجی سرگرمیاں و سیاسی رویے ہیں کہ جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاک ترک عوام ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں ۔یہی وجہ ہے ترکی اور پاکستان کی عوام ہر کٹھن مرحلے اور کڑے سے کڑے امتحان میں ایک دوسرے کی ہم آواز ہوتی ہے ۔ان دونوں ملکوں کا مشترکہ مذہب، اُردو زبان و ادب کے آئے روز ترکی زبان اور ترکی ادب کے اُردو زبان میں تراجم سے معلوم ہوا ہے کہ ان ملکوں کی عوام کی بہت سی عادات و اطوار، سیاسی و سماجی، معاشی حالات و واقعات جڑواں بچوں کی اشکال و عادات کی طرح بے پناہ مماثل ہیں ۔اُردو زبان ایک ایسا شیشے کا پُل ہے کہ جس کے آئینے پر بغیر پھسلن کے خوف کے دونوں قوموں کے ''سفیر ادب و ثقافت'' چل پھر کر نہ صرف ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کبھی برابر کے شریک ہوتے ہوئے قربت محسوس کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے مذہبی، سیاسی و سماجی، معاشی ،نفسیاتی مسائل کا ادراک کرانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے زبان۔

تُرکی ادب کا اُردو زبان میں تراجم کا سلسلہ ویسے تو قیامِ پاکستان سے قبل ہی سجاد حیدر یلدرم نے شروع کر دیا تھا۔ اُن کے ترکی ادب کے اُردو زبان میں کیے گئے تراجم بلاشبہ اُردو زبان پر ایک احسان عظیم سے کم نہیں مگر ان تراجم میں تشنگی کا احساس بھی قاری کے ذہن میں اٹکتا ہے ۔اُس کی وجہ یہ محسوس ہوتی ہے کہ سید سجاد حیدر یلدرم نے ان کہانیوں ،اس کے کرداروں کو بیان کرتے ہوئے کافی صرف برتا ہے ۔ہوسکتا ہے کہ اُس کے پسِ پشت نو آبادیاتی سازشیں کارفرما رہی ہوں کہ تُرکی ادب کو کسی طرح برصغیر پاک و ہند میں متعارف نہ ہونے دیا جائے۔ بہرحال قیامِ پاکستان کے بعد دوملکوں سے سفارتی وثقافتی روابط کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ مسلم رہی ہے اور اس خلا کو مترجمین ،سفیر پورا کرتے ہیں ۔کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ کی شخصیت دوملکوں اور بالخصوص تُرکی میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔آپ اول اول ترکی زبان سیکھنے پر پاکستان کے لیے تُرکی میں مترجم کا کام سرانجام دیتے رہے مگر بعد ازاں ترکی ادب اور نامور ترکی ادیبوں کی دوسو سے زائد کہانیوں کے اُردو زبان میں تراجم کرنے پر بالآخر ''سفیر ثقافت'' کہلائے۔

بقول پروفیسر فتح محمد ملک:

> ''کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ کی تہذیبی خدمات منفرد وممتاز بھی ہیں اور نادر و نایاب بھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ دو برادر قوموں، پاکستان اور تُرکی کے درمیان اُس تہذیبی اور تخلیقی پُل کی تعمیر ہے جس پر سے فکر و خیال اور جذبہ و احساس کی سواریاں بڑے تسلسل اور تواتر کے ساتھ آنے جانے لگی ہیں ۔اِس پُل کی پہلی اینٹ گذشتہ صدی کے اوائل میں سید سجاد حیدر یلدرم نے رکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد خان کی ادبی اصلاحی تحریک کے زیر اثر ترکی ادبیات وفنون سے رسم وسلوک زور وشور سے جاری تھا۔ ملتِ اسلامی کی دو بڑی قوموں کے ادب وفن میں مشترک عناصر اور جذبہ و احساس کی یگانگت کو اُجاگر کرنے کی یہ سعی مشکور خلافت تحریک کے عروج و زوال تک جاری رہی۔ یہ تحریک خلافت کے زوال ہی کا شاخسانہ ہے کہ

سید سجاد حیدر یلدرم نے اِس پُل کی تعمیر کے ارادے سے جو اینٹ جہاں رکھی تھی وہیں رکھی رہ گئی۔ نہ پُل تعمیر ہو سکا اور نہ پاکستان اور ترکی کے درمیان فکر و خیال کا لین دین جاری رہ سکا۔ ایک مدت مدید کے بعد کرنل مسعود اختر شیخ نے اس تہذیبی پُل کے تصور کو حقیقت کر دکھایا۔ اُن کا یہ کارنامہ فقط ادبی و تہذیبی ہی نہیں بلکہ قومی و ملی اہمیت کا حامل بھی ہے'۔(۵)

اس بات میں کچھ شک نہیں کہ ترجمہ ہر دور میں کم و بیش ہر زبان کی اہم ضرورت رہا ہے ۔یوں مختلف قوموں، زبانوں اور ثقافتوں کا ایک دوسرے سے میلان و رغبت بڑھتے ہیں ۔یہی وہ فن بھی ہے کہ جس کے ذریعے انسانی علوم میں اضافہ بھی ہوتا آیا ہے۔

کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ کے تراجم نے نہ صرف دونوں ممالک کی ثقافت کو ایک دوسرے پر آشکار کیا ہے بلکہ دونوں خطوں کی علمی و ادبی ضرورتوں کو بھی زیرِ بحث لانے کا باعث بنا ہے ۔یہ ترجمہ ہی ہے جو کسی مقامی ادیب کو دوسری زبانوں میں متعارف کرواتا اور تخلیق کا مقام بھی متعین کرنے میں مددگار رہا ہے۔

کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ راولپنڈی میں ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔آپ نے ۲۸ سال تک مختلف فوجی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۳ء میں ترکی زبان کے ترجمان کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور ۱۹۶۶ء میں ترکی سٹاف کالج کورس کے لیے منتخب کئے گئے۔آپ ۱۹۶۷ء تک استنبول میں رہے ۔اس دوران میں آپ نے ترکی ادب کو پڑھا اور مقامی ادیبوں سے روابط بڑھائے۔جن میں سے اہم طنز و مزاح کے شہنشاہ ترک ادیب''عزیز نہ سن'' کا نام سرفہرست ہے ۔۱۹۷۲ء میں جب آپ کو چار سال کے لیے ترکی بھیجا گیا تو وہ عرصہ آپ کے ترجمے کے جوہر دکھانے کے لیے بیش قیمت ثابت ہوا۔کرنل صاحب نے اس عرصے کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور ترکی زبان و ادب کو مزید دلجمعی سے پڑھا اور ترجمے کی کسوٹی پر پرکھا۔کرنل صاحب کی ترکی ادب سے اُردو زبان میں ترجمہ کی گئی آٹھ کتابیں پاک ترک ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکی ہیں ۔آپ کی پہلی کتاب''تماشائے اہل کرم'' ہے جو عزیز نہ سن کی سترہ کہانیوں پر مشتمل ہے اور جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اِس کتاب کے متعلق کرنل مسعود اختر شیخ کہتے ہیں کہ: ''اُس کتاب کو پاکستان کے ادبی حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ میرے لیے بے حد حوصلہ افزا ثابت ہوئی''۔(۶) کرنل مسعود اختر شیخ کی ترکی زبان اَدب سے محبت کی انتہا کو پروفیسر فتح محمد ملک یوں بیان کرتے ہیں کہ:

کرنل مسعود اختر شیخ اب تک ترکی کے عصری ادب کے دوسو سے زائد نمائندہ ادب پارے انگریزی، اُردو اور دیگر پاکستانی زبانوں میں منتقل کر چکے ہیں ۔اُنھوں نے ہمیں ترکی فکشن سے بطور خاص متعارف کرایا ہے ۔اُن کی کتاب''ترکی کے بہترین افسانے'' ترکی کے تئیس (۲۳) نامور افسانہ نگاروں کے چونتیس (۳۴) افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے ۔۔۔۔۔۔افسانوں کے ساتھ ساتھ کرنل مسعود اختر شیخ نے ہمیں ترکی ناولوں، ڈراموں اور شاعری سے بھی متعارف کرایا ہے۔شاعر اور افسانہ نگار عزیز نہ سن ان کا محبوب ترین ترک تخلیق کار ہے۔(۷)

اُردو ادب میں طنز و مزاح ایک قدیم روایت ہے جس کا آغاز جعفر زٹلی سے ہوتا ہوا آج کے دورِ جدید تک

آن پہنچا ہے۔

مظفر حنفی اِس روایت کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''آزادی سے قبل اُردو کے آسمان ادب پر جعفر زٹلی سے رشید احمد صدیقی تک طنز و مزاح کی جو کہکشاں پھیلتی گئی ہے اس میں سوداؔ، انشا اور اکبرالہ آبادی جیسے بانکے شاعر بھی موجود ہیں نیز منشی سجاد حسین، عظیم بیگ چغتائی اور پطرس جیسے البیلے نثر نگار بھی۔ان میں کلیتاً طنز و ظرافت پر اکتفا کرنے والے اصحابِ قلم بھی ہیں اور وہ لکھنے والے بھی جن کا اصل مزاج تو ظریفانہ نہیں تھا لیکن حسبِ ضرورت یا مند کا ذائقہ تبدیل کرنے کی غرض سے انھوں نے وقتاً فوقتاً طنز و مزاح کے میدان میں بھی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا۔'' (۸)

یہی وہ طنز و مزاح کی روایت اور ثقافتی ہم آہنگی ہے کہ جس کی اہمیت کو کرنل مسعود اختر شیخ نے ترجمے کے ابتدائی دور میں ہی محسوس کر لیا اور یوں اُن کی پہلی ترجمہ تخلیق عزیز نہ سِن کی ۲۰ کہانیوں پر مشتمل کتاب ''تماشائے اہل کرم'' منظر عام پر آئی جو پہلے ایڈیشن میں ۱۷تھیں مگر بعد ازاں دوسرے ایڈیشن میں تین کہانیاں ترجمہ کر کے شامل کر دی گئیں۔ یکے بعد دیگرے ۲۷ کہانیوں پر مشتمل ہمارے امریکی مہمان اور انیس بصورت خطوط کہانیوں پر مشتمل ''مردہ گدھے کے خطوط'' شائع ہوئیں۔

عزیز نہ سِن کی ان تینوں تخلیقات کا اُردو زبان میں ترجمہ کرنے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر ایک اہم وجہ ہمارے مشترکہ مسائل ہیں۔وہ مسائل عام الناس کی دین ہوں یا سیاست دانوں کی عوام کو عزیز نہ سِن کا بیان انھیں پاکستانی ثقافت میں رنگ دیتا ہے اور رہتی کسر کو کرنل صاحب نے بطور مترجم پورا کر دیا ہو گا۔

عزیز نہ سِن کی طنز و مزاح سے بھرپور تحریروں کا ثبوت بجا طور پر یہ کہانیاں تو ہیں ہی مگر اس کی دلیل خود مترجم یوں پیش کرتے ہیں کہ:

> ''خوش قسمتی سے میرے شائع شدہ تراجم میں سے بعض پر (مرحوم) ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے یہ کہہ کر میری حوصلہ افزائی کی کہ ''ہماری قوم کو ہنسانے کی بے حد ضرورت ہے۔آپ ترکی کے اِس ادیب کی کہانیوں کو کتابی شکل دے سکیں تو یہ اِس قوم کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ چنانچہ میں نے عزیز نہ سِن کی سترہ کہانیوں پر مشتمل اپنی پہلی کتاب کا مسودہ تیار کیا اور اُن سے درخواست کی کہ اسے پڑھ کر رائے دیں کہ آیا یہ کتاب پاکستان کے ادبی حلقوں کی پذیرائی کے قابل ہے یا نہیں۔فیض صاحب نے کچھ عرصے کے مسودہ لوٹاتے ہوئے فرمایا ''کرنل صاحب، کتاب نہایت عمدہ ہے۔ضرور شائع کروایئے لیکن اپنے لیے نوکری کا کوئی اور بندوبست کر لیجئے۔ کیونکہ اس کتاب میں حکومتِ وقت پر اتنی چوٹیں کی گئیں ہیں کہ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے آپ پر حکومت کا عتاب نازل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔'' (۹)

''تماشائے اہل کرم'' ۲۰ کہانیوں پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے کہ جس میں کتاب کے عنوان سے لے کر کہانیوں

کے موضوعات سماجی و سیاسی نیز اقتصادی استحصال پر کُھلا احتجاج کر رہے ہیں ۔''تماشائے اہلِ کرم'' ایک ایسا موضوع ہے کہ جو پاک ترک مشترکہ درد محسوس ہوتا ہے، اور یہ تماشا ہمیں اہلِ کرم، اہلِ ستم اور ہر ہر سطح کے اہل کے ہاتھوں سہنا پڑا ہے۔ اُس کی وجہ عزیز نہ سن اپنی پہلی کہانی کے عنوان میں واضح لفظوں میں بتا دیتے ہیں کہ'' آہ ہم گدھے'' بس ''ہیں'' لگانا ادیب نے شاید اس لیے مناسب نہ سمجھا ہو گا کہ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے مگر وہ جو ہیں ہی گدھے وہ کیا خاک سمجھیں گے؟ ان کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ عنوان پڑھتے ہی ہمیں لگتا ہے کہ ہم اپنے دیس کے حالات کو ترک ادیب کی نوکِ قلم سے نکلتا دیکھ رہے ہیں۔''تماشائے اہلِ کرم'' کو بطور پہلی کتاب اُردو زبان میں ترجمہ کر کے کرنل صاحب نے اُردو زبان و ادب پر ایک احسان عظیم کیا ہے ۔عزیز نہ سن جن کا اصل نام نصرت تھا، امریکہ، جرمنی، فرانس، روس، یونان، ایران اور مشرقی یورپ کے اکثر مما لک میں نہایت شوق سے پڑھایا جاتا ہے ۔ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد دوملین سے تجاوز کر چکی ہے ۔بقول کرنل مسعود اختر شیخ:

> ''اب تک کسی دوسرے ترکی ادیب کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ۔۔۔عزیز نہ سن کی چبھتی تحریریں ابتدا سے ہی سرکاری سانڈوں کے لئے سرخ چیتھڑے کا کام کرتی تھیں۔۔۔۔جونہی پبلشرز کو پتہ چلتا کہ فلاں قلمی نام کے پیچھے نہ سن کا قلم کارفرما ہے وہ ہوشیار ہو جاتے اور قلمی نام بھی ہمیشہ کے لئے بلیک لسٹ ہو جاتا ۔لیکن نہ سن فوراً کوئی دوسرا قلمی نام چُن کر آئندہ کسی نئے نام کی آڑ میں اپنی تحریریں شائع کروانے لگتا۔۔۔۔۱۹۵۶ء میں عزیز نہ سن کو مزاح کا پہلا بین الاقوامی گولڈ پام ایوارڈ ملا۔۔۔۔عزیز نہ سن کی کہانیاں محض لوگوں کے دل بہلاوے کے لئے نہیں لکھی گئیں۔وہ کہتا ہے ''میں بنیادی طور پر لوگوں کو رُلانے کے لئے لکھتا ہوں، لیکن میری تحریریں پڑھ کر لوگ اکثر قہقہے لگاتے ہیں ۔ مجھے اس سے بے حد مایوسی ہوتی ہے'' ۔(۱۰)

اورحقیقت بھی یہی ہے کہ غم و غصے کی شدت سے مارا ہوا ادیب ہی اعلیٰ پائے کا مزاح پیدا کرتا ہے جس میں طنز کی کاٹ واضح محسوس کی جاسکتی ہے ۔عزیز نہ سن کا یہ المیہ پاکستانی طنز ومزاح کا بھی رہا ہے چاہے وہ اس میدان کے شاعر ہوں یا ادیب ۔ یہ دونوں مما لک کی مشترکہ ثقافت بن چکی ہے کہ ان کی عوام طنز کی کاٹ کو کم اور مزاح سے ٹھٹھے کا لطف جلد اخذ کر لیتے ہیں ۔کچھ طنز ومزاح کا کلچر ایسا ہے کہ اس میں سیاسی وسماجی قابلِ نفرت کرداروں سے نفرت کی بجائے ،اُن کے حال پر رحم آنے لگتا ہے ۔یہی ایک مزاح نگار کی خوبی ہے کہ وہ تلخ سے تلخ حقیقت کو استعاراتی و علامتی پیرائے میں اس طرح بیان کرے کہ اصل سماجی مرض کی نشاندہی ہو جائے یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے مصداق ہوا ۔''تماشائے اہل کرم'' کی کہانیوں کے موضوع دیکھیں تو فوراً اپنا پاکستانی معاشرہ اور اس کے لوگوں، علاقوں کی ثقافت نظروں کے سامنے اور آوازیں دماغ میں گونجنے لگتی ہیں۔ آہ ہم گدھے ،ایک ایسی کہانی ہے کہ جس میں گدھے کے استعارے کے ذریعے انسان کی کم عقلی و بے ہمتی کی داستان رقم کی گئی ہے ۔مثال ملاحظہ کیجئے:

''ڈھیں چُوں۔ ڈھیں چُوں

وہ دِن اور آج کا دِن، ہماری قوم گفتار کی نعمت سے محروم ہے۔اس معذوری کی وجہ سے اب ہم اپنے تمام خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار رینک رینک کر ہی کرتے ہیں۔وہ بڑھا گدھا آخری دَم تک حقیقت کونظر انداز کر کے اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دے کر انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ خطرہ اُس کے سَر پرآ گیا۔اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ہمیں اپنی پیاری زبان سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے۔آج ہم بھی آپ سب کی طرح اہلِ زبان ہوتے۔

آہ، ہم گدھے! آہ، ہماری یہ مظلوم قوم!

ڈھیں چُوں۔ ڈھیں چُوں ۔(۱۱)

گفتار سے محرومی ایک ایسی علامت ہے کہ جس میں وہ جمہوری قدروں کا فقدان، نالائق سیاست دان، اپنی زبان سے دوری (کلچر سے دوری) اپنے ہم وطنوں کی کم عقلی، بےضمیری، استحصالی نظام کے خطرے کی بُو، کا اظہار کرتے ہیں۔پیارے زبان سے محرومی''کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا'' کے معنوں میں بھی آتی ہے اور سب سے بڑھ کر آزادی اظہار رائے سے محرومی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اپنی قدروں کی ناقدری کا رونا اور نو آبادیاتی نظام (Clonial System) کا ایک اور نئے انداز سے گھات لگانا نیا یا جدید نو آبادیاتی نظام (Neo Clonialisim) کی خبر دینا عزیز نہ سِن کے طنز ومزاح کا حصہ رہا ہے۔کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے ہم پاکستانی اور ترک نو آبادیاتی نظام کے شکنجے اور شیطانی ہتھکنڈوں کونظر انداز نہیں کر سکتے۔ترک قوم نے اس پیغام اپنی جمہوری قدروں کے دفاع کے لیے سمجھا اور وہ رات کے اندھیرے میں وار کرنے والوں کے خلاف ساری ساری رات بھی سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں سینہ سپر رہے ہیں۔اسی طرح کی باخبری پاکستانی قوم کو بھی ۱۹۶۵ء میں رہی ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشق کی حدتک بڑھا ہوا حُب الوطنی کا جذبہ دونوں مما لک کے عوام کی ثقافت کا اولین حصہ ہے۔وہ ایک اور مسئلہ ہے کہ عاشق اکثر کبوتر کی طرح آنکھیں بھی بند ہی رکھتا ہے اور بےخبری میں مارا جاتا ہے۔مثال ملاحظہ کیجئے:

''بھیڑیا نہیں ہے میری جان۔ بھلا بھیڑیا کیوں ہونے لگا؟"

بھیڑئے نے بڑھے گدھے کی پُشت میں ایک پنجہ گاڑ دیا۔گدھا سہم گیا اور بھیڑئے سے کہنے لگا:

''میں جانتا ہوں بھائی۔خُوب جانتا ہوں کہ تم بھیڑیئے نہیں۔میری پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھو کیونکہ مجھے بڑی گُد گُدی ہو رہی ہے۔ویسے بھی مجھے مذاق بالکل اچھا نہیں لگتا''۔

بھیڑئے نے اپنے لمبے لمبے تیز دانت بڑھے گدھے کی پیٹھ میں گاڑ دیئے اور گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا نوچ لیا۔گدھا درد کی شدّت سے زمین پر گر پڑا''۔(۱۲)

اجنبیوں، مہمانوں اور جاننے والوں کے لیے گھر کے دروازے وَا کر دینا۔اُنھیں مصیبت میں دیکھ کر اُن کی امداد کرنا

۔ یہ اسلامی اقدار بھی ہیں اور ہم دونوں مسلمان ممالک کا ثقافتی ورثہ بھی مگر اسی بے خبری میں ہم اپنی ناقدری کروا بیٹھتے ہیں ۔جیسا کہ Neo Colonial System زبان وثقافت پر یلغار کر کے گھر بیٹھے اپنے اہداف پر کام کر رہا ہے ۔اُسے اب ملکوں ملکوں اپنے وجود کے ساتھ پھرنے کی ضرورت نہیں ۔

''تماشائے اہلِ کرم'' میں ہی موجود ایک کہانی ''گڈریا اور میمنا'' ہے کہ جس میں ظالم گڈریا مظلوم میمنے سے بھیڑوں کی طرح دودھ کے حصول کی توقع میں ظلم ڈھاتا اور اُس کا ظلم سہہ سہہ کر میمنے کی برداشت کی حد جواب دے گئی اور وہ ایک خونخوار بھیریئے کے برابر طاقتور بن گیا۔''افسوس ظالم گڈریے ۔تمہیں میرا خیال ذرا دیر سے آیا ہے'' میمنے نے یہ کہا اور غُرّا کر گڈریے پر حملہ کر دیا۔ گڈریے نے لاکھ بھاگنے کی کوشش کی ،مگر اُس میمنے کے پنجوں سے نہ بچ سکا جواب بھیڑا بن چکا تھا ۔(۱۳) گڈریا اور میمنا ، دوسماجوں کا مشترکہ دُکھ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر اُس ترقی پذیر وترقی یافتہ معاشرے کا المیہ ہے کہ جہاں ظالم ومظلوم مختلف حیثیتوں میں نظر آتے ہیں ، چاہے وہ حکمران اورعوام ہو ، آجر و مزدور، صنعتکار وعملہ، مالک و ملازم ،استحصالی و سامراجی قوتیں وغریب ممالک غرض ہر ایک کی داستان ہے ۔دونوں ممالک کا بنیادی مشترکہ مسئلہ نااہل حکمران بھی رہا ہے ۔جسے عزیز نہ سِن اسی مجموعے کی ایک اور کہانی ''گدھا اور تمغہ خدمت'' میں بیان کرتے ہیں کہ عنانِ سلطنت سنبھالنے والوں کو اپنے اصل فرائض سرانجام دینے کے لیے غلط اور نکمے مشیر پالنے کی ضرورت پڑے تو سماج کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور ملک میں ترقی کا نہ صرف عمل رُک جاتا ہے بلکہ مستحق کو جائز حق ملنا بند ہو جاتا ہے۔ یہی کسی ملک کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے۔جب ''گدھا اور تمغہ خدمت'' کے آخیر میں ایک گدھا آ کر بادشاہ کو اپنی ہستی کی اہمیت جتاتا ہے تو قاری و ناقد ادیب کے فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔مثال ملاحظہ کیجئے:

> ''بادشاہ سلامت، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کی سب سے زیادہ خدمت تو گدھے ہی کرتے ہیں ۔ذرا خیال کیجئے اگر مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں گدے آپ کی سلطنت میں موجود نہ ہوتے تو آپ اتنی مُدّت شاہی تخت پر کیوں کر براجمان رہ سکتے تھے۔اپنی اس ناچیز مخلوق کو دُعا دیجئے جنھیں لوگ گدھا سمجھتے ہیں اور جن کی بدولت آپ کی کُرسی بدستور محفوظ چلی آرہی ہے''۔(۱۴)

سیاسی نظام اور نظامِ حکومت پر طنز مزاح کے غلاف میں ایسا لپٹا ہوا ہے کہ بے اختیار ہنسی کا فوارہ پھوٹتا ہے اور یہاں احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ یہ حالات عزیز نہ سِن ترکی و پاکستان میں سے کس کے بیان کر رہے ہیں ۔تماشائے اہلِ کرم کی ہر کہانی سماج کے مختلف سامراجی و استحصالی رویوں کا احتجاج ہے ۔جن میں ''چارہ گر،قوم کا پیسہ،عوام جاگ اُٹھے، بھیانک خواب،تختہ الٹنے کی گائیڈ بُک ،نہیں جائیں گے !نہیں جائیں گے ، اول سڑ ،آخر سڑک ، بڑے صاحب کا سالا، رشوت خور لمیٹڈ، پھانسی لگا دو، میرا کیا قصور، عزت کا سوال ہے ، چور بھائی، سُور کی دُم، اُف یہ گھڑیاں، تیمارداری ہو تو ایسی، گم شدہ مُردے کی تلاش میں'' ایسے موضوعات ہیں کہ جن کو ہم ''اسم با مسمیٰ'' کہیں تو بے جان نہ ہوگا کیونکہ عنوان دونوں ملکوں کا سیاسی وسماجی کلچر سامنے لے آتا ہے ۔

چارہ گر اور قوم کا پیسہ ایسی دو کہانیاں ہیں کہ جس سے ہم بخوبی جان لیتے ہیں کہ انتخابات سے پہلے ووٹ کے حصول کے لیے وعدے کرنے والوں کے وعدے ریت پر لکھی تحریریں ثابت ہوتی ہیں۔

کرنل مسعود اختر شیخ، عزیز نہ سن کی تمام کہانیوں میں رقم طنز کے پس پردہ کارفرما مقصد کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''عزیز نہ سن سیاسی طنز میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ سیاسی جماعتیں اور سیاستدان اس کے ہر دلعزیز ہدف رہے ہیں۔انتخابات سے پہلے عوام سے کئے گئے وعدے۔انتخابات کے دوران کی جانے والی دھاندلیاں، برسرِ اقتدار آنے کے بعد، اور مخالفت کا کردار ادا کرتے ہوئے سیاسی پارٹیوں کے کرتوت عزیز نہ سن کی کہانیوں کے لئے مواد مہیا کرتے رہے ہیں۔'' (۱۵)

کرنل صاحب نے عزیز نہ سن کی ہر کہانی کی اصل رُوح کو جان لیا تھا اور یہاں ان مشترکہ ثقافتی مسائل میں ''یک جان دو قالب'' ہوتے نظر آتے ہیں۔دوسرے ترجمہ شدہ مجموعہ ''ہمارے امریکی مہمان'' میں بیان ''ہمارے امریکی مہمان، مفرور حمدی، ہمارا ٹارزن، اول آنے والا ڈاکٹر، کشتہ اغلاط، آپ بیتی میری خودکشی کی، ذاتی مکان، جنگل کا قانون، خواب اور حقیقت، بے نظیر ہمسایہ ملک، پچاس پیسے کی خاطر آزادی تحریر، سرکاری ملازم، اقبال جرم، سیاستدان اور پاگل، ایک تھا بادشاہ، چانٹے کے بعد، برش کا بال وغیرہ کہانیوں کے ایسے عنوانات ہیں کہ جن کی زمین پاکستانی معاشرے ہی کی ثقافتی فضا لگتی ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کیجئے: (۱) ہماری بڑی بیٹی بھی تو امریکن کالج میں پڑھ رہی ہے۔کم از کم مہمانوں سے گٹ مٹ انگریزی تو بول لے گی۔تمہارے ہاں Yes، Noاور Ok کے علاوہ کسی کو چوتھا لفظ انگریزی کا نہیں آتا''۔ (ہمارے امریکی مہمان،ص۔۲۳)،(۲) ''تُف ہے امریکہ والوں پر۔یعنی ہم سب خواہ مخواہ ہی اپنے گھر کی صفائی کر کر کے جانیں ہلکان کرتے رہے؟ نئے پردے خریدے، سفیدی کرائی، لیمپ، قالین۔۔۔۔اب کیا ہوگا؟ اگر وہ نہ آئے تو بڑا ظلم ہوگا حسن!'' (ایضاً،ص۔۲۴)،(۳) ''چھوٹے بچوں کو ٹارزن کی دم کھینچنے اور اس کے جسم پر میخیں گاڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔۔۔۔۔اگر درد کی شدت انتہا کو جا پہنچے تو ٹارزن کے منہ سے عجیب وغریب دردناک قسم کی آواز نکلتی ہے جو کسی دوسرے کتے کی آواز سے نہیں ملتی۔(ٹارزن مشمولہ ہمارے امریکی مہمان،ص۔۳۸)،(۴)۔۔۔۔کچھ عرصے بعد ایک امریکی فیملی ہمارے محلے میں آ کر رہنے لگی۔ان کا آنا تھا کہ ٹارزن کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اُٹھی۔۔۔۔امریکی خود ہر روز نہاتے یا نہ، ٹارزن کو ضرور غسل دلاتے۔۔۔۔ٹارزن روز بروز زیادہ خوبصورت اور سمارٹ ہوتا گیا۔(ایضاً،ص۔۴۱۔۴۰)

الغرض ''ہمارے امریکی مہمان'' میں ''امریکی مہمان'' وہ علامت ہے کہ جو مسلم معاشروں میں اپنی ثقافت کا زہر خود اُن معاشروں میں داخل ہوئے بغیر مختلف ذرائع سے انجیکٹ کرتے رہتے ہیں اور ہماری نوجوان نسل انھی کو نہ سمجھتے ہوئے اپنی تہذیب و ثقافت میں نئے سے نئے کلچر کی جگہ بنانے کی گنجائش نکالتی جا رہی ہے یعنی یہ ہمارے اپنے مَن چاہے مہمان ہیں۔''مہمان'' دراصل ایسی خصائص و اطوار کی علامت ہے جسے عزیز نہ سن نے مختلف کہانیوں کی صورت واضح موضوعات کے تحت پیش کر کے موجودہ اور آنے والی نسلوں کو دَرپیش چیلنجز سے آگاہ کر دیا

ہے ۔ یہ ایسی خوفناک یلغار ہے کہ جس کے شکنجے میں نوجوان نسل بُری طرح سے جکڑی جارہی ہے ۔اپنے آباء کے ہمارے بزرگ اچھے پیروکار تھے کہ اُن کے ثقافتی رنگ میں ہمیں رنگنے کے لیے طرح طرح کے لائحہ عمل کرتے رہے ۔مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنے بزرگوں کی اچھی پیروی کرنے میں کامیاب ہیں ۔یقیناً نہیں ورنہ آج ہم اپنی نوجوان نسل کو مختلف شیطانی یلغاروں سے محفوظ کر سکتے ۔ہمارے آج کے نوجوان کے پاس کیا ثقافتی ورثے کی منتقلی کا عمل درستگی سے سرانجام پارہا ہے؟ اس کا جواب ڈاکٹر سید عبداللہ کی زبانی کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''میں ذاتی طور پر نئی پود کی کسی مخصوص ومنفرد ثقافت سے باخبر نہیں ہوں مگر میں نے اکثر یہ شکایت سُنی ہے کہ نوجوانوں میں خودسری، بدوضعی، بے لحاظی اور اخلاقی بے رنگی عام ہورہی ہے ۔یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ اب ان کے رویے ،مزاجی یا بے سماجی رویوں کا رنگ اختیار کرتے جاتے ہیں ۔ان کی تفریحات ، ان کی وضع اور ان کا عام برتاؤ عجیب وغریب ہوتا جاتا ہے اور وہ ایک ایسی انداز زندگی کرتے جاتے ہیں جو لا اُبالی اور بے وضع اور بے فکرے لوگوں کا ہونا چاہئے''۔(۱۶)

مندرجہ بالا تمام کہانیوں کی مختلف مثالوں سے ایک بات تو واضح ہے کہ ہماری مسلم ثقافت میں کسی فرنگی کلچر کی گنجائش نہیں نکلتی ہاں مگر ''ٹارزن'' سمیت اور بہت سی باتیں یہ واضح اشارے ہیں کہ ہماری وہ مشترکہ ثقافت جسے فرنگی ،نو آبادیاتی نظام کے گھن چکر میں الجھا کر ہم سے چھین لے گیا ۔اُس کے اُس صحت مند حصوں کو ہم نے واپس اپنے مسلم معاشروں میں رائج کرنا ہے خواہ وہ سیاست ہو یا سماج کے دوسرے رنگ تاکہ ہماری نئی اسلامی ثقافتی روح کا احیاء (Neo Spiritual Culture Revival) ممکن ہو سکے۔اسی خلاء کو پر کرنے کے لئے فاضل مترجم نے ترکی کے ایک نامور جدید مفکر سعید نورسی کی حیات وخدمات پر لکھی گئی کتاب کا ترجمہ بھی کیا جو کہ ڈاکٹر رمضان بالجہ کی تصنیف ہے۔

سعید نورسیؒ جدید ترکی کے قیام کے نہ صرف عینی شاہد تھے بلکہ انہوں نے اپنی مفکرانہ روشن خیالی، اصلاح پسند تجدیدی سوچ اور رُوحانی بالیدگی سے ایک عالَم کو متاثر کیا۔حق بات کو بیان کرنے سے وہ اُس وقت بھی نہ ڈرے کہ جب جدید ترکی کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور یہ بنیاد سیکولرازم پر کھڑی تھی ۔انہیں ایک رات خواب میں شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کی زیارت ہوتی ہے اور وہ انہیں حکم دیتے ہیں کہ وہ میران قبیلے کے رئیس مصطفیٰ پاشا کے پاس جائیں اور اسے سیدھے راستے پر آنے کی تلقین کریں اور اگر وہ ظلم سے باز آکر نماز پڑھنا شروع نہ کرے تو اُسے قتل کر دیں۔ سعید نورسی دوسرے ہی دن پوچھتے پوچھتے مصطفیٰ پاشا کے خیمے میں پہنچے ۔اُس نے آنے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا:

> ''یا تُو ظلم سے باز آکر نماز ادا کرنی شروع کر دے اور یا پھر میں تجھے جان سے مار دوں گا''(۱۷)

ایک جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کا فریضہ ادا کرنا ازروئے حدیث مبارکہ افضل جہاد ہے ۔یہ اسلوب حیات ، پاک ترک مشترکہ تہذیبی ورثے کا طرہ امتیاز ہے ۔

ہر مسلمان فرض نمازوں کے بعد کچھ اوراد و ظائف بھی پڑھنے کا عادی ہوتا ہے۔ یوں تو ان کی قرات کے کئی جواز پیش کئے جاسکتے ہیں مگر ایک بات سے ہر کسی کو اتفاق ہو گا کہ یہ اوراد فضول یاوہ گوئی سے بچانے کا بہترین ذریعہ بھی ہیں۔ انسان اپنا وقت یادِ خُدا میں بسر کر کے دلی سکون کی دولت سمیٹتا ہے۔ روحانی ثمرات ان پر مستزاد ہیں۔ سعید نورسیؒ کی زندگی میں اوراد کیلئے رات کا پچھلا پہر بالخصوص مقرر رہا۔ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھ کر نماز فجر تک اوراد وظائف میں مشغول رہتے تھے۔

بزرگانِ دین کی پاکیزہ زندگیاں، انکے کشف و کرامات کے واقعات اور ان سے والہانہ محبت کا یہ انداز بھی پاک ترک مشترکہ تہذیبی و ثقافتی ورثے کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ سعید نورسیؒ کی پاکیزہ زندگی کے بارے میں لکھی گئی مذکورہ کتاب اُن کی زندگی کے اسرار کے ساتھ ساتھ ان کی محنت و مشقت، خلوص، معاشرے میں اصلاحی کردار اور نمود و نمائش سے احتراز جیسے خصائص کو بھی آشکار کرتی ہے۔ ایسی ہستیاں ہی دراصل ہمارے معاشرے میں اعتدال اور میانہ روی کو فروغ دیتی ہیں۔

سعید نورسی کے مشہور اقوال اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں:

''ایک شخص کی غلطی کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس کے لیے اسکے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب پر ظلم نہیں کیا جاسکتا''

''سرکاری ملازمین کا کام عوام پر حکم چلانا نہیں بلکہ ان کی خدمت کرنا ہے''

''اصل آزادی وہ ہے جس میں فرد نہ خود اپنے آپ کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے''

(بدیع الزمان سعید نورسی، ص۔ ۲۷۳-۲۷۲)

اسلام نے انسانیت کو جس امن دوستی، مساوات، بھائی چارے اور خیر خواہی کی نوید دی اسکی عملی تصویر سعید نورسی جیسے قدسی نفوس کی حیات سے اجاگر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی جیسی سیکولر سلطنت میں کم و بیش ایک صدی گذرنے کے باوجود بھی اسلام پسندی ختم نہیں ہوئی۔ دینِ اسلام سے قلبی لگاؤ کے یہ سارے مظاہر پاک ترک مشترکہ تہذیبی و ثقافتی ورثے کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

کرنل صاحب کی ترجمہ شدہ آٹھ کتابوں میں سے لامحالہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ عزیز نہ سن کی تیسری ترجمہ کی گئی کتاب ''مردے گدھے کے خطوط'' اپنی نوعیت کی دلچسپ کتاب ہے کہ جس میں ادیب دو خطوط ''بھڑ'' کے نام اور باقی سترہ خطوط ''خر مکھی'' کے نام ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ادیب سماج کے وہ رنگ پیش کرتا ہے کہ جو ہماری مشترک اسلامی ثقافت تو کبھی بھی نہیں رہے مگر اب ہمارا ورثہ معلوم ہونے لگے ہیں۔ عزیز نہ سن انسان کے لیے گدھے کا استعارہ اپنی تحریروں میں کافی استعمال کرتے ہیں مگر یہاں مردہ گدھے سے مراد ایک ایسا انسان ہے کہ جو مرنے کے بعد دوسری دُنیا میں جہنم میں زیادہ لطف اندوز ہوتے ہوئے دُنیا میں زندگی کی محرومیوں اور مرنے کے بعد کے سماجی رویوں کو بیان کرتا ہے۔ تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خطوط انسانی معاشرے میں بسنے والے انسان نما درندوں کی بے حسی اور ایک دوسرے کو نوچ کھانے والوں کی حماقتوں، بے وقوفیوں، بے ایمانیوں، کمینگیوں، بے

ضمیریوں کی ایسی کہانی ہے ۔جس میں ادیب کا کمالِ فن یوں جھلکتا ہے کہ ان مردہ گدھوں کے نام لکھے گئے خطوط کے آئینے میں ہمارے اپنے معاشرے میں بسنے والے زندہ و مردہ گدھوں کی تصویریں اور ان کی دوست مکھیاں ، ڈنک مارنے والی بھڑیں نظر آنے لگتی ہیں ۔

یہ سب کیا ہے؟ گدھا وہ انسان ہے جو تمام عمر ہر بوجھ جذبات سے عاری ہو کر اُٹھاتا ہے اور مکھی وہ دوست جو ویسے تو ہر وقت اُس کے ساتھ ہوتی مگر زخم آنے پر سب سے پہلے خود گدھے پر بھنبھناتی ہے ۔بھڑ وہ دوست نما دشمن جو ذرا سی راہ پا کر ڈنک مارتے ہیں ۔انسانوں کے اس سماج میں اپنے حقوق سے نابلد گدھے اور موقع کی تاک میں رہنے والے بھڑ اور مکھیاں جابجا ملتے ہیں ۔گدھا بنیادی طور پر ایسی علامت ہے کہ جس میں پاک تُرک علامتی ثقافتی ورثہ زیادہ مشترک وقریب محسوس ہوتا ہے ۔اس گدھوں کے دیس میں انسان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے ۔ ہر دوسرا آدمی عزیز نہ سن کے ہاں جب گدھیانہ اوصاف میں ایک دوسرے سے بازی لیتا نظر آتا ہے تو یہی وہ ادیب کا کمال ہے جسے مترجم نے بھی کمال فن سے قلمایا ہے ۔''مردہ گدھے کے خطوط'' سے سماج و سیاست کے مختلف رنگ رُوپ کی مثالیں کچھ یوں ہیں : اُس اندھوں کی دنیا میں جس کسی کی قدر شناسی نہیں ہوتی اُس کی آخری اُمید اِس زیرِ زمین گاؤں میں آنے کے بعد بر آتی ہے''۔(پہلا خط مشمولہ مردہ گدھے کے خطوط،ص-۱۷)''اس ٹھاٹھ باٹھ کے کیا کہنے لیکن بوجھ تلے تم بھی زندگی گزار رہے ہو اور میں بھی بوجھ تلے زندگی گزار رہا ہوں ۔۔۔''(ایضاً)،''موت کو تو پوری کی پُوری ذلت ہی سمجھو۔ میرے مرنے کے بعد آنسو بہانے والے دو ہی شخص ہیں ۔ایک واصل اور دوسرا وِدات ، میں نے ایک کا ہزار لیرا اُدھار لوٹانا تھا اور دوسرے کے سو لیرے''۔(ایضاً، ص-۱۹) بھئی کسی کو اطلاع دو ،کوئی ڈاکٹر ماکٹر بھجوا دے سب کی آنکھوں کے سامنے مر رہا ہے بیچارہ (دوسرا خط مشمولہ مردہ گدھے کے خطوط، ص -۳۱)؛''عزیز ہم وطنو، لائن بناؤ لائن۔۔۔باری باری۔۔۔دھکم پیل نہ کریں۔۔۔اگر لائن بنالیں تو سب دیکھ سکیں گے۔۔۔'' (ایضاً،ص-۳۲)،

''تو گویا تمہارا خون خشک ہو گیا تھا''،

نہیں میرے بھائی ۔خون تھا کہاں کہ خشک ہو جاتا ۔انسان کا خون خُشک ہو جائے تو فوراً راقی

پی لے،

خون پانی بن جاتا ہے ۔ (چوتھا خط مشمولہ مُردہ گدھے کے خطوط،ص-۴۸)

''میں نے اپنے گذشتہ خط میں تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں اگلے خط میں بتاؤں گا کہ ہماری ایمبولینس کیسے مرمت کی گئی اور ہمیں ہسپتال کیسے پہنچایا گیا''۔(پانچواں خط ،ص-۵۷)، اگر اس زخمی مریض کی موت نہیں آئی ہوئی تو ان شاء اللہ ضرور کام کا پُرزہ اِن پُرزوں میں سے مل جائے گا۔(ایضاً،ص-۵۹)، میرے تیرے جیسوں کے لیے زندگی دُشوار تو ہے مگر پھر بھی بڑی پیاری ہے ۔(نواں خط،ص -۹۷)''اس دُنیا میں سرکاری طور پر جینا اور سرکاری طور پر مَرنا دونوں بہت مشکل ہیں''۔ (گیارھواں خط،ص-۱۰۹)، خاص کر اِس آخری میچ میں شکست کے بعد میں کسی صورت زندہ رہنا نہیں چاہتا ۔خودکشی کر رہا ہوں ۔(ایضاً ،ص-۱۱۱) ارے میاں، گیس کہاں سے آئی کہ تم خود

کشی کرتے ؟ اس پائپ سے گیس نہیں،صرف ہوا اندر آتی ہے اور پھر ہوا بھی سب سے صاف سُتھری۔ (ایضاً ، ص -۱۱۲)ننگی عورتیں ،مرد، بوڑھے، جوان سب موجود تھے ۔اُن مُردوں نے مجھے آگھیرا۔(تیرھواں خط، ص-۱۳۸)،ڈاکٹر نے کہا: ''اِسے غُسل دے دو'۔اُسے بتایا گیا کہ پانی نہیں ہے ۔آج کل پھر شہر سے پانی غائب ہے۔ (ایضاً ،ص -۱۴۳) ''انہوں نے مجھے جہنم کی تہہ میں پھینک دیا۔جب تک میں زندہ تھا مجھے جہنم سے ڈرایا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ جگہ ایسی بُری بھی نہیں ہے کہ اِس سے خوف کھایا جائے''۔(انیسواں خط،ص-۱۷۳)

انیس خطوط میں ایک مرنے والا معاشرتی مسائل کا ہر وہ رُوپ پیش کر رہا ہے جو ہر طرح سے پاکستانی سماج کا عکاس ہے۔گیس، پانی کی قلت ، ایمبولینس کا خراب رہنا، زندہ جسموں کے ساتھ مردہ آدمی، دھکم پیل ،زندگی کی دوڑ میں ، اپنے ہم جنسوں کو کچلنے سے بھی دریغ نہ کرنا۔مگر انیس خطوط لکھتے ہوئے ہر خط میں بے شمار سماجی مسائل سسکتی اسلامی ثقافت کو روندنے کا کام سب سے پہلے ہم عوام الناس ہی سرانجام دیتے ہیں ۔ترکی اور پاکستانی کی عوام میں بھی ہر طرح کے لوگ شامل ہیں ۔کوئی موقع پرست ،کوئی لاپرواہ و بیگانہ،کوئی بے وقوف تو کوئی شیطان کا چیلا۔ بقول ڈاکٹر داؤد رہبر: ہر ملت میں مہذب اور نازک طبع اور روادار افراد بھی ملتے ہیں اور اکھڑ اور بدتمیز افراد بھی ۔آوازیں کسنے والے اور دوسرے فرقے یا ملت کی توہین کرنے والے غیر مہذب لوگوں کو بے ادبی سے کون اور کس طرح روکے''۔(۱۸) ''چھوٹے لوگ' بڑے لوگ'' ہمارے معاشرے کے طبقاتی فرق کو بخوبی عیاں کرنے والا افسانہ ہے ۔غریب کے بچے کے لیے سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی ایک آسمانی نعمت سے کم نہیں ہوتا ۔لیکن امیر بچے کے لیے روٹی سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں ۔اُسے اس بارے میں کوئی تردّد نہیں ہوتا کہ کون روٹی لائے گا؟ کہاں سے لائے گا؟ حرام ہو گی یا حلال؟ وغیرہ ۔مذکورہ صدر کہانی میں افسانہ نگار نے ایک باریک نفسیاتی نکتہ بھی بیان کیا ہے ۔وہ یہ ہے کہ امیر کا بچہ بھی غریب کے بچے کی طرح کچی مٹی میں کھیلنے کا متمنی ہوتا ہے مگر اس کے ماں باپ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے ۔بقول فسانہ نگار کے: ''محل والوں کا بچہ تو اس سائیکل سے' ان جوتوں سے اور اس محل سے تنگ آچکا تھا اسکے دل میں خواہش تھی کہ اپنا سر ، پاؤں اور کپڑے گندے کرے ، پاخانے کی باتیں کرے، کیچڑ میں پاؤں رکھے''۔ (۱۹) ۔افسانہ ''مرغی کا گوشت'' غربت کی چکی میں پستے ہوئے ایسے گھرانے کی کہانی ہے کہ جسکے سربراہ کو بیماری کے علاج کے لیے مناسب اور معقول رقم بھی میسر نہیں ۔اسکی اہلیہ دیسی ٹونے ٹوٹکوں سے اسکا علاج کرتی ہیں مگر کچھ افاقہ نہیں ہوتا۔ انتہا یہ کہ وہ کسی کے کہنے پر ایک کتے کے پلّے کو تل کر اُسے کھانے کو دے دیتی ہیں۔

''چپڑاسی صاحب'' افسانے میں سرکاری اداروں میں چھوٹے ملازمین کی بدعنوانی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔یہ بدعنوان ملازم اپنے آپ کو بے تاج بادشاہ سمجھتے ہیں ۔ایک ڈائریکٹر جنرل کا چپڑاسی ایک ملاقاتی کو ٹرخانے کیلئے اس طرح تحکمانہ انداز اختیار کرتا ہے :

> ''ارے تم بات تو سمجھو گے ہی نہیں ناں ! ہم نے کہا ہے ڈائریکٹر جنرل مصروف ہیں ۔تمہارے سر میں عقل، سرچ، سمجھ، یا ہوش نہیں ہے کیا؟ تمہیں ترکی زبان نہیں آتی کیا؟ انسان کو ایک بات

ایک ہی مرتبہ کہہ دینی کافی ہوتی ہے۔ڈائریکٹر جنرل مصروف ہیں''۔

(''چپڑاسی صاحب'' مشمولہ: دوشرابی، ص۔۱۳)

اسی طرح افسانہ ''خوف'' ایک ایماندار مگر بزدل سرکاری ملازم کی کتھا ہے۔وہ اپنا کام محنت اور ایمانداری سے کرتا ہے مگر صرف اپنی بزدلی کی وجہ سے ملازمت سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔اس لیے کہ اپنے اوپر لگنے والے الزام کے وقت اسکے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔اس کا حاکمِ اعلیٰ اسی بات کو اسکی بددیانتی پر محمول کر کے اسے ملازمت سے فارغ خطی دے دیتا ہے۔

''جھگڑا روٹی کا'' ایسے معاشرے کی کہانی ہے کہ جہاں ہر طرف غربت و افلاس کا راج ہے۔لوگوں کو فقط روٹی کھانے سے ہی دلچسپی ہے۔اس کا ساماں یوں ہوتا ہے کہ فوج کی ایک یونٹ وہاں اقامت گزین ہوتی ہے۔ فوجی لنگر کے بچے کھچے ٹکڑوں پر'پرندے' جانور' لاغر کتے بلیاں اور غریب بھکاری پل رہے ہیں۔دو عورتیں بھی ان میں شامل ہیں۔مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں:

''جنگ ہونے والی ہے' جنگ! کہتے ہیں ماسکو نے پھر سر اُٹھایا ہے''

دونوں تھوڑی دیر خوف سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہیں پھر ایک آنکھ سے اندھی بڑھیا سر ہلا کر بولی:

''اچھا تو گویا پھر سر اُٹھایا ہے اُس نے'' (۲۰)

بین السطور واضح طور پر پڑھا جاسکتا ہے کہ ان غریب خواتین کے لیے جنگ محض اس لیے بُری ہے کہ اس سے انکی روٹی کا وہ وسیلہ ختم ہو جائے گا جو انہیں فی الوقت میسر ہے۔کیوں کہ فوجی یونٹ جنگ کی صورت میں وہاں سے یقیناً کسی اور طرف چلا جائے گا۔

''راہوں کے ساتھی'' کی کہانیاں ہائے ظالم مراد، شکاری، بستر، جھاڑو، ہمت مرداں، خنجر اور فصلیں معاشرے کے اُن سسکتے ہوئے طبقات کی کہانیاں ہیں کہ جو پاک ترک دونوں معاشروں میں پلنے والے موضوعات ہیں۔اس میں موجود ''راہوں کے ساتھی'' ایسی مظلوم عورت کی داستان ہے کہ جسے اُس کا شوہر کسی چھوٹی سی بات پر طلاق دے دیتا ہے۔وہ خاتون طلاق کے کاغذات وصول کر کے دل گرفتہ سی سڑک کے کنارے کنارے چل رہی ہوتی ہے۔ایک تانگہ بان اُسے اپنے تانگے میں بٹھا لیتا ہے۔جیسا کہ اکثر تانگہ بانوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ سوار سے خواہ مخواہ گپ لگا کر اپنا وقت گزارتے ہیں۔یونہی تانگہ بان کی اس عورت سے بات چیت ہوتی ہے تو اسے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسکے شوہر نے بڑی بے وقوفی کی ہے کیونکہ وہ ایک حسین عورت ہوتی ہے۔پھر وہ اسے یہ بتاتا ہے کہ اسکی خاصی جائیداد وغیرہ ہے اور یہ کہ اسکی بیوی یا اسکا کوئی بھی رشتہ دار موجود نہیں ہے۔یعنی بیٹے بیٹیاں۔عورت یہی بات سوچ کر اسکے ساتھ رہنے کو تیار ہو جاتی ہے۔افسانے کا کردار ان ڈرامائی مکالموں پر ہوتا ہے:

''کوچوان نے یاد دلایا: ''آمنہ تمہارا گاؤں آ گیا''

عورت نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا: ہاں میرا گاؤں''

اور کوچوان نے گھوڑوں کو پھر چابک لگائی۔ یکہ سیدھی سڑک پر گرد وغبار کے بادل اڑاتا حمیدیہ گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا''۔(۲۱)

مشترک ثقافتی ورثے پر بات کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ مقالہ ہٰذا میں درج ہر ہر کہانی کا حوالہ و ذکر موضوع دراصل وہ قومی خصلتیں ہیں کہ جن سے مل کر اُس ملک وقوم کی ثقافت پروان چڑھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر داؤد رہبر:

''ثقافتی رجحانات کی بحث میں کسی ایک طبقے کو موضوعِ سُخن بنانا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ رجحانات دراصل مجموعی قومی خصائص سے پیدا ہوئے ہیں لہٰذا ان کے بُرے پہلوؤں کا مداوا یا تدبیر مجموعی قومی پیمانے پر ہونا چاہئے ---اس لیے اگر رنگ ثقافت کو بدلنا مقصود ہے تو روح افکار میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔میرے اپنے خیال میں ہمارے ملک میں تین اہم امور کی طرف توجہ ہونی چاہئے۔ان میں پہلی چیز ضمیر داری کی تحریک ہے ---دوسری چیز---اس خیال کی تربیت ہے کہ وفاداری کا رشتہ، انفرادی اور اجتماعی آسائش اور ترقی کا ایک اہم وسیلہ ہے ---اب تیسری چیز جس کیلئے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے وہ ہے سلیقہ شہرت، سلیقہ شہرت میں تمام اجتماعی آداب اور عادات شامل ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو حسین بنا سکتی ہیں۔(۲۲)

مجموعی قومی خصائص کی مزید تفصیل ''ترکی کے بہترین افسانے'' سے ملتی ہے۔اس کتاب میں کرنل صاحب قاری کو ترکی کے ۲۳ بڑے افسانہ نگاروں سے متعارف کراتے ہیں۔اس میں صرف کہانی ہی کہانی کار کا تعارف نہیں بلکہ ہر افسانہ نگار کا الگ مختصر تعارف اُس کی کہانیوں کے آغاز میں پیش کرتے ہیں۔

ان کہانیوں کا کمال یہ ہے کہ ان میں پاکستانی اور ترکی کی مشترکہ ثقافت چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے اور اس کہانی میں ہمارے لئے کوئی اجنبیت نہیں بلکہ اس کہانی کے پار دیکھیں تو اپنے ہی کھیت، محلے، گلیاں ،لوگ چلتے پھرتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔جیسے ہم اس کہانی کے ہمسائے میں ہی جی رہے ہوں۔پہلا افسانہ ''بلیاں'' کی کہانی کا پلاٹ وہی ہے جو مشتاق احمد یوسفی کی ''اور آنا گھر میں مرغیوں کا'' ہے۔دونوں میں بیگمات کو اپنے خاوندوں سے زیادہ جانوروں سے پیار ہے اور دونوں کہانیوں میں بیگمات کے لیے خاوند کے گھر چھوڑنے کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ بلیاں اور مرغیاں اہم ہیں۔

''بیگم! آج مجھے آخری مرتبہ بتا دو۔ میں یا بلیاں؟''

''بلیاں''

''بلیاں''؟ تو یہ بات ہے۔گویا ہماری تیس سالہ رفاقت کا یہی صلہ ملتا تھا مجھے(۲۳)

ضمیر کی آواز ،مُرغا ، بڑھاپا، امی ابو، ہے کوئی پاک دامن یہاں؟ ایسے سماجی ونفسیاتی مسائل پر مبنی کہانیاں ہیں جن کا شکار دُنیا کا ہر دوسرا انسان ہے مگر بڑھاپا ، ایک ایسے میاں بیوی کی کہانی ہے جو خالصتاً پاک ترک مشترکہ نظام

خاندان کی بنا پر جنم لینے والی ثقافت ہے۔''ضمیر کی آواز'' ایک ایسا احساس جرم ہے جو ہر شخص کے اندر کہیں نہ کہیں تڑپ کر صدا ضرور بلند کرتا ہے۔

الغرض''بلیاں'' سے لے کر''سارے بھکاریوں کی امّاں'' تک کی کہانیوں کے پلاٹ پاکستانی ادیبوں کی کہانیوں کے بھی پلاٹ ہیں۔جن سے پاک ترک ثقافت کی مشترک باس محسوس کی جاسکتی ہے جو کبھی ذہنوں کو معطر کرتی اور کبھی دلوں کو دھچکا لگاتی ہے مگر ہماری مشترک ثقافت کی غمازی کرتی ہیں۔جنھیں کرنل صاحب نے شب و روز کی عرق ریزی کے بعد ہمارے لیے حاصل حصول کی منزل تک پہنچایا۔

حسن کمال گر، سفیر جمہوریہ ترکیہ اسلام آباد، کرنل صاحب کی اس عبادت و ریاضت کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں کہ:

> ''انہوں نے جو کچھ لکھا ہے بالکل غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے لکھا ہے۔ان کے مضامین کا پاک۔ترک دوستی پر، کہ جو بڑی سے بڑی آزمائشوں پر پوری اُتر چکی ہے نہایت گہرا اثر پڑا ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر قسم کے تعصب اور انتہا پسندی سے پاک ہونے کی وجہ سے مسعود اختر شیخ کی تحریریں فنِ تحریر اور فکر دونوں شعبوں کے لئے نہایت ممد و معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ہمارے کرنل نے جس طرح ادبیات ، کلچر اور آرٹ سے متعلقہ اپنی سرگرمیوں کے ذریعے ترکی سفارت خانے کی مدد کی ہے اسے کسی طور پر ناپنا ممکن نہیں ہے۔ اِس چنار کی خوبیاں یہ ہیں کہ وہ کاملاً ترقی پسند ہے۔دوسرا یہ کہ وہ کام کرنے کے لازوال جوش و ولولے کا مالک ہے۔اب تو ہمارے ہاں یہ روائت قائم ہو چکی ہے کہ ان کی خوبیوں کے باعث ترکی کے جتنے سفیر یہاں رہ چکے ہیں وہ سب، اور ہماری وزارت خارجہ کا عملہ اور ترکی کے دوسرے اداروں کے متعلقہ افراد مسعود اختر شیخ کو دل سے چاہتے ہیں ،اُن کی عزت کرتے ہیں اور ان کے کام کو سراہتے ہیں۔ظاہر ہے یہ چاہت یک طرفہ نہیں ہے۔(۲۴)

حوالہ جات:

(۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۔۴۲

(۲) وزیر آغا، ڈاکٹر، ''کلچر کا مسئلہ''، مشمولہ پاکستانی ثقافت، مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص۔۹۴

(۳) جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص۔۴۲

(۴) جیلانی کامران، قومیت کی تشکیل اور اُردو زبان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص۔۱۳۴

(۵) فتح محمد ملک، پروفیسر، ''حرفِ اول''، مشمولہ ہمارے امریکی مہمان از عزیز نہ سن ، مترجم: کرنل (ریٹائرڈ) مسعود

اختر شیخ، ENCORE، نومبر، ۲۰۰۶ء، ص-۶

(۶) مسعود اختر شیخ، کرنل (ریٹائرڈ)، ''پیش لفظ''، مشمولہ ترکی کے بہترین افسانے، مسعود پبلشرز، اسلام آباد، یکم مارچ ۲۰۰۹ء، ص-۱۴

(۷) فتح محمد ملک، پروفیسر، ''حرفِ اوّل''، مشمولہ ہمارے امریکی مہمان، ص-۶

(۸) مظفرحنفی، اُردو ادب میں طنزو مزاح کی روایت، کلاسیک، لاہور، س۔ن، ص-۵

(۹) مسعود اختر شیخ، کرنل، ''پیش لفظ'' (دوسرا ایڈیشن) مشمولہ تماشائے اہلِ کرم اور عزیز نہ سِن، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص-۵

(۱۰) مسعود اختر شیخ، کرنل، ''عزیز نہ سِن، طنز ومزاح کا عظیم ادیب''، مشمولہ مردہ گدھے کے خطوط، مسعود پبلشرز، اسلام آباد، یکم مارچ ۲۰۱۱ء، ص-۱۴-۱۱

(۱۱) عزیز نہ سِن، ''آہ ہم گدھے''، مشمولہ تماشائے اہلِ کرم، مترجم: کرنل مسعود اختر شیخ، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، اپریل، ۲۰۰۸ء، ص-۱۵

(۱۲) ایضاً، ص-۱۴

(۱۳) عزیز نہ سِن، ''گڈریا اور مینا''، مشمولہ تماشائے اہلِ کرم، ص-۲۲

(۱۴) عزیز نہ سِن، ''گدھا اور تمغہ خدمت''، مشمولہ تماشائے اہلِ کرم، ص-۲۸

(۱۵) مسعود اختر شیخ، کرنل، عزیز نہ سِن، ''طنز ومزاح کا عظیم ادیب''، مشمولہ ہمارے امریکی مہمان، ص-۱۷

(۱۶) سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''پاکستانی کلچر- جدید ترین رجحانات''، مشمولہ کلچر کا مسئلہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص-۸۸

(۱۷) رمضان بالجہ، ڈاکٹر، بدیع الزمان سعید نورسی، مترجم: کرنل مسعود اختر شیخ، ہارمونی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص-۴۲

(۱۸) داؤد رہبر، ڈاکٹر، کلچر کے روحانی عناصر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص-۱۶۰

(۱۹) اور خاں کمال، ''چھوٹے بڑے لوگ''، مشمولہ دو شرابی، مترجم: کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ، مسعود پبلشرز، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۸ء، ص-۲

(۲۰) اور خاں کمال ''جھگڑا روٹی کا''، مشمولہ جھگڑا روٹی کا، مترجم: کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ، مسعود پبلشر اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۹ء، ص-۴

(۲۱) ''راہوں کے ساتھی''، مشمولہ راہوں کے ساتھی، یشار کمال، مترجم: کرنل (ریٹائرڈ) مسعود اختر شیخ، مسعود پبلشر اسلام آباد، اگست ۲۰۱۲ء، ص-۹

(۲۲) داؤد رہبر، ڈاکٹر، کلچر کے روحانی عناصر، ص-۹۲-۹۱

(۲۳) سمیع پاشا زادہ سرائی، ''بلیاں''، مشمولہ ترکی کے بہترین افسانے، ص-۱۸

(۲۴) حسن کمال گر، ''خراج تحسین''، مشمولہ مردہ گدھے کے خطوط، ص-۷-۶